قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی ـــــ درس ۱۱

بندہ مؤمن کی شخصیت کے خدوخال

سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 35869501-03

www.tanzeem.org

بندۂ مؤمن کی شخصیت کے خدوخال

سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا
مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ
اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا
خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ﴿۶۴﴾
وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ
غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا
وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا
اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ
یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ یُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَیَخْلُدْ فِیْهٖ
مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ
سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا
فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا
بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا
صُمًّا وَّعُمْیَانًا ﴿۷۳﴾ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ
اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا
وَیُلَقَّوْنَ فِیْهَا تَحِیَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾
قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّیْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ یَكُوْنُ
لِزَامًا ﴿۷۷﴾﴾ (الفرقان)

’’بہت ہی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور روشن چاند بنایا۔ اور وہی ہے کہ جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے تعاقب میں لگا دیا‘ (اس میں نشانیاں ہیں) ہر اُس شخص کے لیے جو یاد دہانی اخذ کرنا چاہے یا شکر کی روش اختیار کرنا چاہے۔ اور رحمٰن کے محبوب بندے تو وہ ہیں جو زمین پر چلتے ہیں تو اضع اور نرمی کے ساتھ اور جب اُن سے جاہل لوگ الجھتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ جو راتیں بسر کرتے ہیں اپنے ربّ کے حضور میں سجدہ کرتے ہوئے اور دست بستہ کھڑے رہ کر۔ اور وہ جو یہ کہتے ہیں اے رب ہمارے! پھیر دے ہم سے جہنم کے عذاب کو‘ یقیناً اس کا عذاب چمٹ جانے والی چیز ہے‘ یقیناً وہ بہت بری جگہ ہے مستقل جائے قرار ہونے کے اعتبار سے بھی اور عارضی قیام گاہ کے اعتبار سے بھی۔ اور وہ جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی سے کام لیتے ہیں نہ بخل سے‘ بلکہ اُن کی روش اس کے بین بین ہوتی ہے۔ اور وہ جو نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو‘ اور نہ قتل کرتے ہیں کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ‘ اور نہ زنا کرتے ہیں— اور جو کوئی بھی یہ کرے گا وہ اس کی پاداش بھگت کر رہے گا۔ دوگنا کر دیا جائے گا اس کے لیے عذاب کو قیامت کے دن اور وہ اس میں رہے گا ہمیشہ ہمیشہ ذلیل وخوار ہو کر‘ سوائے اس کے جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور اچھے عمل کرے‘ تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ بھلائیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا‘ رحم فرمانے والا۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو حقیقتاً وہی ہے جو ایسی توبہ کرتا ہے جیسے کہ توبہ کرنے کا حق ہے— اور وہ جو جھوٹ پر اپنی موجودگی تک گوارا نہیں کرتے اور اگر کسی لغو کام کے پاس سے اُن کا اتفاقاً گزر ہو جائے تو بھی دامن کو بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اور وہ جنہیں جب اُن کے ربّ کی آیات کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں ٹوٹ پڑتے۔ اور وہ جو یہ کہتے ہیں کہ اے ربّ ہمارے! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں اپنے نیک بندوں کے آگے چلنے والا بنا۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہیں بدلہ میں بالا خانے ملیں گے بعوض اُس صبر کے جو انہوں نے کیا‘ اور

وہاں ان کا استقبال ہوگا نیک دعاؤں اور سلام کے ساتھ۔ وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش‘ اور وہ بہت ہی عمدہ جگہ ہے مستقل جائے قرار ہونے کی حیثیت سے بھی اور عارضی قیام گاہ ہونے کے اعتبار سے بھی۔ (اے نبی!) کہہ دیجئے: میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے اگر نہ ہوتا تمہیں پکارنا۔ پس تم نے جھٹلا دیا ہے تو اب یہ جھوٹ جلد تم پر لاگو ہو کر رہے گا۔‘‘

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار مطالعہ ان صفحات میں ہو رہا ہے‘ اس کا درس نمبر ۱۱ سورۃ الفرقان کی آیات ۶۱ تا ۷۷ پر مشتمل ہے۔ اس منتخب نصاب کے پہلے حصے میں چار جامع اسباق تھے۔ دوسرے حصے میں کچھ ایسے مقامات تھے جن کے ذریعے ایمان کے ضمن میں چند مباحث ہمارے سامنے آئے تھے۔ تیسرے حصے میں اعمالِ صالحہ کی بحث ہے جو چل رہی ہے۔ اس کے پہلے سبق میں ان اوصاف کا بیان تھا جو از روئے قرآن حکیم انسان کی سیرت کی تعمیر‘ یا بقول علامہ اقبال مرحوم تعمیرِ خودی کے لیے بنیادی لوازم اور اساسات ہیں۔ زیر درس آیات کے مطالعہ اور ان کی ترجمانی سے آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ گزشتہ سبق کی طرح یہاں بھی چند اوصاف کا ذکر ہو رہا ہے۔ جس طرح سورۃ المؤمنون کے پہلے رکوع میں چھ مرتبہ اسمِ موصولہ ’’اَلَّذِیْنَ‘‘ تکرار کے ساتھ آیا تھا اور سورۃ المعارج کی اُن آیات میں کہ جو سورۃ المؤمنون کی آیات کی ہم مضمون تھیں‘ آٹھ مرتبہ ’’اَلَّذِیْنَ‘‘ کی تکرار ہوئی‘ اسی طرح آج کے درس میں بھی ’’اَلَّذِیْنَ‘‘ ایک مرتبہ آیا ہے اور ’’وَالَّذِیْنَ‘‘ سات مرتبہ دہرایا گیا ہے کہ عباد الرحمٰن یعنی ہمارے محبوب بندوں میں یہ اور یہ اوصاف ہوتے ہیں‘ اُن کی یہ اور یہ کیفیت ہوتی ہے‘ ان کی راتیں اس حال میں اور اس کیفیت میں بسر ہوتی ہیں‘ وہ جب خرچ کرتے ہیں تو اُن کی روش یہ ہوتی ہے‘ وغیرہم۔

غور طلب بات یہ ہے کہ گزشتہ سبق اور اس سبق کے مابین منطقی ربط کیا ہے! آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ اس مقام پر اُن اوصاف کا بیان ہو رہا ہے جنہیں ہم چوٹی کے اوصاف کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ایک پوری طرح تربیت یافتہ خودی یا ایک پوری طرح تعمیر شدہ شخصیت کے یہ خدوخال ہونے چاہئیں۔ ایک بندۂ مومن کے جو نمایاں اوصاف

اللہ کو پسند ہیں‘ ان کا اس سبق میں نہایت جامع بیان آیا ہے۔ اسے ایک مثال سے واضح کیا جائے تو وہ یہ ہوگی کہ جیسے ہم ایک عمارت بناتے ہیں تو اس کا ایک ڈھانچہ (Structure) ہوتا ہے‘ جس میں سیمنٹ‘ لوہا‘ سریا اور لکڑی وغیرہ استعمال ہوتی ہے‘ اور عمارت کی اصل مضبوطی اور اس کا اصل استحکام اس کے Structure کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ پھر اس عمارت کی Finishing اور اس کی آراستگی ہے۔ یعنی عمدہ پلاسٹر ہو‘ رنگ و روغن اعلیٰ ہو اور اس عمارت کے خدوخال کی خوبصورتی مختلف پہلوؤں سے ظاہر ہو رہی ہو۔ ظاہر بات ہے کہ جب آپ کسی عمارت کو دیکھتے ہیں تو اس کا سٹرکچر نگاہوں کے سامنے نہیں آتا۔ وہ تو ایک مخفی اور نظروں سے اوجھل شے ہے۔ جو چیز سامنے آئے گی وہ اس کے نمایاں خدوخال ہیں۔ اگر عمارت دل آویز ہے‘ خوبصورت ہے‘ پلاسٹر اچھا ہے‘ رنگ و روغن عمدہ ہے تو وہ دیدہ زیب ہوگی اور آپ کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچے گی۔ بالکل یہی ربط و تعلق ہمارے سابقہ سبق اور اس سبق میں ہے۔ یوں سمجھئے کہ سیرت و شخصیت کی تعمیر کا اساسی پروگرام تو وہ ہے جس پر ہم دو مقامات کے حوالے سے غور کر چکے ہیں‘ لیکن ایک مکمل تعمیر شدہ انسانی شخصیت میں‘ جس کی تعبیر علامہ اقبال مرحوم نے یوں کی ہے کہ :ع

’’کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مؤمن!‘‘

یہ دل آویزی جن اوصاف سے پیدا ہوتی ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر نہایت جامعیت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔

آیاتِ آفاقی میں غور و فکر کی دعوت

سب سے پہلے ہم اس سبق کی پہلی دو آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان کے ضمن میں جو بحثیں اس سے قبل اس سلسلۂ دروس میں ہو چکی ہیں‘ ان کا نہایت جامع خلاصہ ان دو آیات میں آ گیا ہے۔ فرمایا:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾﴾

’’بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور اس (آسمان) میں ایک چراغ روشن کیا (یعنی سورج) اور روشن چاند بنایا‘‘۔

﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً﴾

’’اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے تعاقب میں لگا دیا‘‘۔

گویا وہ ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہیں۔ رات دن کا پیچھا کرتی ہوئی چلی آتی ہے اور دن جیسے رات کا تعاقب کرتے ہوئے نمودار ہوتا ہے۔ یہ قانونِ طبیعی کی ایک بیّن حقیقت ہے۔ اسے سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں آیاتِ الٰہیہ سے تعبیر کیا گیا تھا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾﴾ اور اس موقع پر ہم نے سورۃ البقرۃ کے اکیسویں رکوع کی پہلی آیت (البقرۃ:۱۶۴) بھی تفصیل سے پڑھی تھی کہ اس کائنات کی ہر شے ایک نشانی ہے جس کو دیکھ کر لامحالہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کا ذہن اُس کے خالق‘ اس کے مالک‘ اس کے صانع اور اس کے مصور کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اس کائنات کے مشاہدات سے اُس ذات کی صفاتِ کمال کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو اِس کائنات کا بنانے والا ہے‘ وہ جو ’’عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ‘‘ ہے‘ اس کی قدرت میں کہیں کوئی کمی نہیں‘ اس کے علم میں کہیں کوئی کمی نہیں‘ اس کی حکمت میں کہیں کوئی کمی نہیں‘ وہ ’’بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ‘‘ ہے‘ اور وہ ہستی ’’اَلْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ‘‘ ہے۔

یہ درحقیقت وہی مضمون ہے جسے یہاں بھی تمہید کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ان آیات آفاقیہ پر غور و تدبر کرتے ہیں‘ جسے علامہ اقبال نے اس طرح تعبیر کیا کہ ؎

کھول آنکھ زمیں دیکھ‘ فلک دیکھ‘ فضا دیکھ!
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

وہ لوگ جو اِس وسیع و عریض کائنات میں پھیلی ہوئی آیات سے اُس کے خالق کی معرفت حاصل کرتے ہیں‘ انہی میں یہ اوصاف پیدا ہوں گے کہ جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ چنانچہ دوسری آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾﴾

''(یہ نشانیاں ہیں) اُس کے لیے جو چاہے تو یاد دہانی حاصل کرے یا چاہے تو (اللہ کا) شکرگزار بنے''۔

ان الفاظِ مبارکہ سے آپ کے ذہن میں سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کا مضمون آ گیا ہوگا کہ کائنات کے مشاہدہ سے جہاں تذکر حاصل ہوتا ہے' یاد دہانی نصیب ہوتی ہے' ذہن اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہاں ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس پیدا ہوتا ہے' اس کے احسانات کا ادراک حاصل ہوتا ہے کہ اُس نے انسان کی روزی کی فراہمی کے لیے کیا عظیم الشان نظام بنایا ہے! اُس نے انسان کی ہر ہر ضرورت کی بہم رسانی کے لیے کیا اعلیٰ انتظام و انصرام فرمایا ہے! وہ انسان کے جسم و جان کے تمام تقاضوں کو کس کس طریقہ سے پورا فرما رہا ہے۔ اس شعور و ادراک سے ایک دوسرا جذبہ جو انسان کے دل میں اُبھرتا ہے وہ جذبۂ شکر ہے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت ذہن میں تازہ کیجیے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ﴾

''ہم نے لقمان کو حکمت اور دانائی عطا فرمائی کہ کر شکر اللہ کا!''

تو معلوم ہوا کہ اس کائنات کے مشاہدہ سے اور آیاتِ سماوی' آیاتِ ارضی' آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی سے ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کو دو چیزیں اخذ کرنی چاہئیں۔ ایک وہ جسے قرآن کریم تذکر سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی اس کائنات کی وسعتوں میں انسان کی نگاہیں اُلجھ کر نہ رہ جائیں' بلکہ ان کو دیکھ کر اُن پر غور و تدبر سے اس کا خالق' اس کا مالک' اس کا صانع' اس کا مصور اور اس کا مدبر یاد آ جائے اور ذہن و شعور اور عقل و ادراک اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جائے۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا ہے۔

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں!

تو دل کی آنکھ سے اس کائنات کے ذریعے اللہ تک پہنچا جائے تو اس کا نام تذکر ہے۔ اور دوسرے یہ کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ادراک ہو' اس کے احسانات کا شعور ہو' جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس کے دل میں تشکر کے جذبات وجود میں آئیں۔ ان دونوں کے لیے یہاں فرمایا گیا: ﴿لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾﴾

عبادالرحمٰن کے چند اوصاف

اس رکوع کی پہلی دو آیات کا مضمون سمجھ لینے کے بعد اب ہم اگلی پانچ آیات (الفرقان: ۶۳ تا ۶۷) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کے اوصاف بیان فرما رہا ہے جو اُسے بہت ہی پسند اور محبوب ہیں۔ چنانچہ گفتگو کی جو ابتدا ہوئی ہے وہ ﴿عِبَادُ الرَّحْمٰنِ﴾ کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ''اَلرَّحْمٰن'' نہایت پیارا نام ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ رحمت سے مشتق ہی ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ بندوں کو جس چیز کی زیادہ احتیاج ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اگرچہ رحمت سے اللہ تعالیٰ کا ایک نام اور بھی بنتا ہے اور وہ ہے ''اَلرَّحِيْمُ''، لیکن ''الرحیم'' میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی شان ایک مستقل اور دائم حقیقت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے' جبکہ ''اَلرَّحْمٰن'' میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جو شان سامنے آتی ہے وہ ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہے' جس میں جوش و خروش ہو' جس میں ہیجان ہو۔ یہ لفظ ہیجان بھی فَعْلَان کے وزن پر عربی ہی کا لفظ ہے۔ اسی وزن پر عربی زبان میں متعدد الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً عَطْشَان' جس سے مراد انتہائی پیاسا' جس کی پیاس سے جان نکلی جا رہی ہو۔ جَوْعَان سے مراد ہے نہایت بھوکا' جو بھوک سے مر رہا ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کا یہ نامِ نامی' اسم گرامی ''اَلرَّحْمٰن'' بہت ہی پیارا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح سامنے آتی ہے۔

پھر ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' کے فرمانے میں بھی ایک محبت اور شفقت و عنایت کا انداز ہے' یعنی اللہ کے محبوب بندے' اللہ کے پسندیدہ بندے یہ ہیں جن میں یہ اوصاف

پائے جاتے ہوں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

(۱) تواضع وانکساری

ان اوصاف میں سے پہلا وصف آیا: ﴿اَلَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ''وہ لوگ جو زمین پر چلتے ہیں آہستگی سے (نرمی سے)''۔ ان کی چال سے تواضع نمایاں ہوتی ہے۔ یہ بات جان لیجئے کہ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ: "Face is the index of the mind." آپ کسی انسان کے چہرے کو دیکھ کر اس کے باطنی احساسات وجذبات کا اندازہ کر سکتے ہیں' اسی طرح انسان کی چال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں غرور ہے' یہ کسی فخر میں مبتلا ہے' یہ گھمنڈی ہے۔ اکڑ کر چلے گا تو اس کی چال بتائے گی کہ اس کی ذہنی کیفیت کیا ہے! یا پھر اس کی چال سے یہ ظاہر ہوگا کہ اس میں عجز وتواضع' فروتنی' انکساری اور خاکساری ہے۔ تو یہ ہے پہلا وصف— اور بندے کو یہ حقیقت پہچان لینی چاہیے کہ میں بندہ ہوں' آقا نہیں ہوں' آقا تو صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہے' باقی بڑے سے بڑا انسان بھی بندہ ہے' اور عبدیت ہی درحقیقت ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے خصوصی عنایت کے ساتھ خطاب فرمایا ہے' یا آپ ﷺ کا ذکر خصوصی محبت وشفقت اور التفات کے ساتھ فرمایا ہے وہاں حضور ﷺ کی عبدیت کو نمایاں کیا جاتا ہے— جیسے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ اور: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ اور جیسے ﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝۱﴾۔ دیکھئے کس قدر لطیف ربط ہمارے سامنے آتا ہے! یہ اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت ہے جس کے آخری رکوع کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے آخری رکوع کا آغاز بھی ''تَبٰرَكَ الَّذِیْ'' کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ آغاز میں فرمایا گیا: ''بڑی بابرکت' بلند مرتبت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (ﷺ) پر الفرقان (یعنی قرآن مجید) نازل فرمایا''۔

تو یہ عبدیت درحقیقت معراجِ انسانیت ہے۔ لہٰذا یہاں ''عِبَادُ الرَّحْمٰن''

فرمانے میں بڑی شفقت' محبت' عنایت اور التفات کے پہلو مضمر ہیں۔ مراد ہیں وہ لوگ جو واقعی اللہ کے بندے ہیں' ان کی چال ڈھال سے نمایاں ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بندہ ہی سمجھتے ہیں' آقا نہیں سمجھتے۔ یہ اپنے آپ کو مملوک سمجھتے ہیں اور اپنے مالک' اپنے آقا کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ ان کی چال گواہی دیتی ہے کہ فخر وغرور کے بجائے ان میں عجز وفروتنی کے احساسات وجذبات جاگزیں ہیں۔

ہمارے اس منتخب نصاب کا جو تیسرا درس سورۂ لقمٰن کے دوسرے رکوع پر مشتمل ہے' اس کے آخر میں بھی اسی وصف پر زور دیا گیا ہے: ﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا' اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝۱۸﴾ حضرت لقمان اپنے بچے کو نصیحت فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اے میرے بچے! اپنے گال لوگوں کے لیے پھلا کر نہ رکھ اور زمین پر اکڑ کر مت چل' بے شک اللہ کو بالکل پسند نہیں ہیں شیخی خورے اور اترانے اور غرور وفخر سے کام لینے والے''۔ تو یہاں نقطۂ آغاز وہ وصف ہے جہاں سورۂ لقمٰن کے دوسرے رکوع کے مضامین کی قریباً انتہا ہوئی تھی۔

(۲) ہٹ دھرمی کے جواب میں طرزِ عمل

اسی آیت میں دوسرا وصف بیان ہوا ہے: ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝۶۳﴾ ''اور جب جاہل اُن سے مخاطب ہوتے ہیں (اور اُن سے اُلجھنا چاہتے ہیں) تو وہ سلام کہہ دیتے ہیں (اور اس طرح اُن سے علیحدہ ہو جاتے ہیں)''۔ یہ بھی درحقیقت انسان کی شخصیت کی پختگی کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔ بعض لوگ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر لوگوں سے بے کار سی بحث وتمحیص میں الجھ جاتے ہیں' حالانکہ اس طرح کی بحث ومباحثہ کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ایک پختہ (Mature) انسان کا لازمی وصف یہ ہوگا کہ وہ اندازہ کرے کہ اس کا مخاطب اس وقت بات سمجھنے کے موڈ (mood) میں ہے یا محض بحث ونزاع پر تلا ہوا ہے۔ اور اگر وہ یہ محسوس کرے کہ یہ شخص اس وقت افہام وتفہیم کے موڈ میں نہیں ہے' یہ میری بات کو سنجیدگی سے نہیں سن رہا' بلکہ ضد اور عناد میں مبتلا ہو چکا ہے' اس وقت اس پر ہٹ دھرمی مسلط ہو چکی ہے' یہ خواہ

مخواہ مجھ سے الجھ رہا ہے' بات کو سمجھنا اس کے پیش نظر سرے سے ہے ہی نہیں' تو بڑی خوبصورتی سے سلام کہہ کر اس سے علیحدہ ہو جائے۔ بعض جوشیلے قسم کے مبلغین ایسے موقع پر تلخی پر اتر آتے ہیں' تلخ کلامی اختیار کر لیتے ہیں' یا علیحدہ بھی ہوتے ہیں تو اس طور سے گویا لٹھ مار کر علیحدہ ہو رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر دوبارہ گفتگو کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اگر آپ خوبصورتی کے ساتھ علیحدگی اختیار کریں تو موقع رہے گا کہ آپ آئندہ کسی مناسب وقت پر جب یہ محسوس کریں کہ یہ شخص سمجھنے سمجھانے کے موڈ میں ہے تو اس کے سامنے دوبارہ اپنی بات رکھنے کی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں بڑی ہی پختہ شخصیت کے نمایاں اوصاف میں سے ہیں' جن سے یہاں گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے۔

(۳) قیام اللیل کا اہتمام

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝۶۴﴾ ''اور جو راتیں بسر کرتے ہیں اپنے ربّ کے حضور میں سجدہ کرتے ہوئے اور دست بستہ کھڑے رہ کر''۔ اب یہاں ایک فوری تقابل (simultaneous contrast) آپ کے سامنے رہے۔ ہمارے سابقہ درس میں نماز کا ذکر بار بار آیا تھا: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲﴾ اور پھر ان اوصاف کا اختتام ان الفاظِ مبارکہ پر ہوا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹﴾ ابتدا بھی صلوٰۃ کے ذکر سے اور اختتام بھی صلوٰۃ کے ذکر پر۔ پہلے صلوٰۃ میں خشوع کا ذکر ہے جو اِس کی باطنی روح ہے اور آخر میں صلوٰۃ کی محافظت اور مداومت کا ذکر ہے۔ لیکن یہاں رات کی نماز یعنی تہجد کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ ایک مسلمان میں جو بنیادی اوصاف درکار ہیں جن سے تعمیر سیرت کا وہ پروگرام وجود میں آتا ہے جو قرآن مجید دیتا ہے' اس کی ابتدا و انتہا اقامت الصلوٰۃ یعنی نمازِ پنجگانہ کا اہتمام ہے جو فرض ہے۔ اس کی پابندی کرنا' اس کے تمام آداب اور جملہ شرائط کے ساتھ اس کی ادائیگی کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہاں بات بالکل دوسری ہے۔ یہاں تو اس سطح کی گفتگو ہو رہی ہے جہاں ایک انسان اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مقام اور درجہ حاصل کر لے۔ یہاں جس نماز کا

ذکر ہے وہ رات کی تنہائی کی نماز ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝۶۴﴾ یعنی اُن کی راتوں کا نقشہ اُن لوگوں کی راتوں کی کیفیت سے بالکل مختلف ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں' جو پوری رات پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں۔ ان کو اس غفلت کا احساس تک نہیں ہوتا' کیونکہ ان کے دل میں کوئی لگن نہیں ہے' ان کے دل میں اللہ کی محبت کا جذبہ نہیں ہے۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت گھر کر چکی ہو اُن کو ان کا وہ جذبۂ محبت رات کے وقت سونے نہیں دیتا۔ وہ رات کو بار بار اٹھتے ہیں' اپنے ربّ کے حضور دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں یا اپنے ربّ کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی رات کی نماز کی کیفیات کے متعلق ہمیں روایات میں یہ نقشہ ملتا ہے کہ آپؐ راتوں کو بار بار اٹھتے تھے' چونک چونک کر اٹھتے تھے اور آپؐ اپنے ربّ کے سامنے نماز میں دست بستہ کھڑے ہوتے تھے' سجدہ ریز ہوتے تھے۔ بندۂ مؤمن کی شخصیت کے تکمیلی اوصاف میں یہ رات کی نماز یعنی تہجد یا قیام اللیل عظیم ترین اہمیت کی حامل ہے۔ اور اساسی و بنیادی اوصاف میں سب سے زیادہ اہم وصف اقامت الصلوٰۃ' یعنی پنج وقتہ فرض نماز کی پابندی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ رات کے وقت کی اس نماز کی پابندی کر رہے ہوں' کیسے ممکن ہے کہ وہ فرض نمازوں کے نظام میں کسی درجہ میں بھی کوتاہی یا غفلت سے کام لیں۔!!

(۴) عذابِ جہنم سے بچاؤ کی دُعا

اس کے بعد فرمایا کہ اپنے ربّ کے سامنے اس قیام اللیل کے نتیجہ میں جو دعا ان کے دل سے نکل کر زبان پر آتی ہے وہ یہ ہے کہ: ﴿رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ﴾ ''اے ربّ ہمارے! جہنم کی سزا سے ہم سے دور کر دے (ہمیں اس سے بچا)''۔ اس میں درحقیقت اس طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جہاں مخلوق کے سامنے ان کی روش تواضع اور فروتنی کی ہوتی ہے' وہاں وہ اپنے ربّ کے سامنے بھی نہایت عاجزی کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ انہیں اپنی نیکی پر کوئی فخر یا غرور نہیں ہوتا۔ وہ کسی زعم یا گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوتے' بلکہ اُن کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ نہ معلوم ہمارے اعمال

اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو رہے ہیں یا نہیں! لہٰذا اُن پر ایک لرزہ طاری رہتا ہے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ النور کے پانچویں رکوع کی آیات میں آ چکا ہے کہ وہ لوگ اپنے ربّ کے عذاب سے خائف رہتے ہیں‘ لرزاں و ترساں رہتے ہیں- چنانچہ ہم کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں یہ پڑھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک عجیب کیفیت کے عالم میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں گھاس کا ایک تنکا ہوتا جو جلا دیا جاتا ہے اور اس سے کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا! کاش میں درختوں پر چہچہانے والی ایک چڑیا ہوتا جو چہچہاتی ہے‘ پھر ختم ہو جاتی ہے‘ لیکن اس سے کوئی محاسبہ نہیں ہوگا! حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ویسے تو آپؓ کا جسم بہت گٹھا ہوا اور بڑا مضبوط تھا‘ لیکن جب آپؓ نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو جسم خشیتِ الٰہی سے نرم پڑ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ آپؓ کے جسم میں ایک تیر پیوست ہو گیا جو نکالے نکل نہیں رہا تھا۔ آپؓ نے فرمایا کہ مجھے نماز کی نیت باندھ لینے دو‘ اس حالت میں تیر نکال لینا۔ یہ ہے وہ کیفیت : ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ﴾ اس کے ساتھ ہی فرمایا: ﴿اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝۶۵﴾ یہ جہنم کا عذاب تو چمٹ جانے والی چیز ہے‘ یہ عذاب تو جان کو لاگو ہو جانے والا ہے‘ اس سے انسان کو چھٹکارا نہیں ملے گا— آگے جہنم کے بارے میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝۶۶﴾ ’’یقیناً وہ مستقر بھی بہت بُرا ہے اور مقام بھی‘‘۔ عربی زبان میں ’’مستقر‘‘ جائے قرار کو کہتے ہیں جہاں انسان کا مستقل ٹھکانا ہو۔ اردو میں بھی مستقر اِسی معنی میں مستعمل ہے۔ اور ’’مقام‘‘ کے معنی ہیں قیام کی جگہ۔ جہاں بھی تھوڑی دیر کے لیے انسان رکتا ہے وہ اُس کا مقام ہے۔ تو اِن الفاظ کے ذریعے یہ تأثر دیا جا رہا ہے کہ جہنم اتنی بری جگہ ہے کہ ارکسی کی مستقل جائے قرار بن جائے تو اس کی بربادی‘ رسوائی اور ہلاکت کا ذکر ہی کیا ہے! یہ تو اتنی بری جگہ ہے کہ اس میں اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی قیام ہو تو یہ اپنی تمام ہولناکیاں اور سختیاں پورے طور پر ظاہر کر دے گی۔ عام طور پر ہمارا یہ تصور ہے کہ کسی اچھی سے اچھی جگہ پر بھی اگر مستقل رہنا پڑے تو اس میں دلچسپی اور رعنائی نہ رہے گی‘ انسان اُکتا

جائے گا‘ اور بری سے بری جگہ پر بھی انسان اگر تھوڑی دیر کے لیے چلا جائے تو یہ تبدیلی اس کے لیے تفریح کا ذریعہ بن جائے گی۔ لیکن یہاں الفاظ ہیں : ﴿اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا﴾— اور اس رکوع کے آخر میں جنت کے بارے میں آئے گا: ﴿حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝۷۶﴾۔ یہ بھی ایک فوری تقابل کے لیے ہے کہ جنت اتنی اچھی جگہ ہے کہ انسان اس میں ہمیشہ کے لیے رہے گا تب بھی اس جنت کی رعنائیوں‘ دل آویزیوں‘ لطافتوں اور دلچسپیوں میں اسے کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی‘ انسان اکتائے گا نہیں‘ اور جہنم اتنی بری جگہ ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اگر کسی کو اس میں داخل کر دیا جائے تو وہ اپنی ساری شدتیں‘ اپنی ساری غلظتیں‘ اپنی ساری کلفتیں آنِ واحد میں ظاہر کر دے گی۔

(۵) اخراجات میں میانہ روی

اس کے بعد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝۶۷﴾

’’وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے‘‘۔

میانہ روی اختیار کرنا بھی شخصیت کی پختگی اور بالغ نظری کی علامت ہے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ اگر ایک وقت ہاتھ کشادہ ہے تو انسان اللّوں تللّوں میں پیسہ اڑا دے اور اگر کسی وقت تنگی ہو گئی ہو تو انسان بالکل بجھ کر رہ جائے— اور نہ ایسا ہو کہ جہاں خرچ لازمی اور ضروری ہو وہاں وہ ہاتھ روک لے‘ یہ بخیلی ہے— ان تین رویوں کے بجائے ایک بین بین اور معتدل روش اختیار کرنا ایک اعلیٰ و ارفع وصف ہے۔ لہٰذا فرمایا وہ لوگ جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف سے کام لیتے ہیں نہ بخل سے کام لیتے ہیں‘ بلکہ ان کا طرزِ عمل اس کے بین بین ہوتا ہے۔ یہ بات بھی سورۂ لقمٰن کے دوسرے رکوع کے آخر میں آئی تھی: ﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ﴾ ’’اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر‘‘— یہاں چال ڈھال میں بھی اعتدال مراد ہے اور خرچ میں بھی— تو وہی وصف ہے جو یہاں ایک

دوسرے اسلوب سے بیان ہوا۔

کبیرہ گناہوں سے اجتناب

اگلی دو آیات میں فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ ﴾

''اور وہ لوگ جو نہیں پکارتے اللہ کے سوا کسی اور معبود کو' اور نہ وہ قتل کرتے ہیں کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ' اور نہ ہی وہ زنا کرتے ہیں' اور جو کوئی یہ کام کرے گا وہ اس کی پاداش پائے گا۔ دوگنا کیا جائے گا اس کے لیے عذاب کو قیامت کے دن' اور وہ رہے گا اس میں ہمیشہ ہمیش نہایت ذلیل وخوار ہو کر''۔

اُن مثبت اوصاف اور مثبت اقدار کے ذکر کے بعد جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں' جن سے ایک بندۂ مؤمن کی شخصیت میں دل آویزی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے اور جو ایک مؤمن کی شخصیت کی پختگی اور "maturity" کی علامات ہیں' اب ان دو آیات میں اندازِ بیان منفی ہے۔ یعنی عباد الرحمٰن میں یہ چیزیں بالکل نہیں ہوتیں' وہ اِن چیزوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔

اس سلسلے میں قرآن مجید کی حکمت کا ایک اہم باب ہمارے سامنے آ رہا ہے کہ وہ کون کون سے کام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مغضوب اور مبغوض ہیں' جن سے وہ سخت ناراض ہوتا ہے اور جن سے اس کا غیظ وغضب شدید ترین طور پر بھڑکتا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ ہمارے یہاں جو یہ تصور ہے کہ ایک گناہ کبیرہ ہوتے ہیں اور ایک گناہ صغیرہ ہوتے ہیں۔ تو ہم سمجھیں کہ کبیرہ گناہوں میں چوٹی کے گناہ کون سے ہیں! ان دو آیات میں سے پہلی آیت چوٹی کے تین گناہوں کو معین کر رہی ہے۔ یعنی اس ایک آیت میں کبائر میں سے درجہ بدرجہ تین سب سے بڑے گناہوں کا ذکر ہے۔

اکبر الکبائر : سب سے کبیرہ گناہ' عظیم ترین گناہ' جس کے بارے میں سورۃ النساء میں دو مرتبہ یہ الفاظ وارد ہوئے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ ''بے شک اللہ اِس کو تو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ اُس کے شرک کیا جائے اور اس سے کمتر (گناہ) جس کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا''۔ گویا قرآن مجید کی رُو سے ہمارے دین میں سب سے بڑا جرم' سب سے بڑا اور قطعی ناقابلِ معافی گناہ شرک ہے۔

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کے ضمن میں ''اقسامِ شرک'' کے موضوع پر کچھ مختصر گفتگو ہوئی تھی کہ ایک شرک ہے شرک فی الذات۔ یعنی اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ اور ایک شرک وہ ہے جو اللہ کی صفات کے ضمن میں ہے' یعنی شرک فی الصفات۔ اور تیسرا شرک ہے شرک فی العبادت۔ اور نبی اکرم ﷺ نے عبادت کے لبِّ لباب کی حیثیت دعا کو دی ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ))(۱) ''دعا ہی عبادت کا اصل جوہر ہے۔'' ایک اور جگہ ارشاد ہے: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةِ))(۲) ''دعا ہی اصل عبادت ہے''۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ''وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے''۔ یہ پکارنا کس مقصد کے لیے ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ استمداد' استدعا' استغاثہ اور استعانت کے لیے۔ یعنی پکارنا کسی کو اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے۔ پکارنا کسی کو اپنی کسی مصیبت کو دور کرنے کے لیے۔ پکارنا کسی کو اپنی حاجت روائی کے لیے۔ پکارنا کسی کو اپنی مشکل کشائی اور دستگیری کے لیے..... پکارنا کسی کو اپنی مدد واعانت کے لیے۔ غور کیجیے کہ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ''اللہ کو چھوڑ کر کسی اور معبود کو پکارے'' بلکہ الفاظ ہیں: ''اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارنا'' یہ شرک ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ ہمارے دین میں شرک تو اکبر الکبائر ہے۔ کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا کبیرہ گناہ شرک ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللہ ﷺ' باب المنہ۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ' باب ومن سورۃ البقرۃ۔

چنانچہ آغاز میں سب سے پہلے تو اُسی کا ذکر ہوا۔ اس لیے کہ درحقیقت شرک سے انسان کا نقطۂ نظر غلط ہو جاتا ہے۔ گویا پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی لگ گئی تو اس کے بعد اس کا جو نتیجہ نکلے گا وہ ظاہر ہے کہ ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

پھر تو کجی ہی کجی ہوگی۔ انسان کی اپنی ذاتی سیرت میں بھی کجی ہوگی۔ ایسے لوگوں پر مشتمل جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ بھی کج ہوگا۔ لہٰذا یہاں سب سے پہلے شرک کا ذکر ہوا۔

قتل ناحق : دوسرے بڑے گناہ کا ذکر بایں الفاظ ہوا: ﴿وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ ''اور جو نہ قتل کرتے ہیں کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ''۔ اس کا تعلق انسانی جان کے احترام سے ہے۔ یہ بات جان لیجیے کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قتلِ عمد ہے' اس لیے کہ اس سے تمدن کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ انسان ایک متمدن حیوان ہے' انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ "Man is a gregarious animal" تمدن کی بنیاد مل جل کر رہنا ہے۔ تہذیب' تمدن اور حضارت مل جل کر رہنے سے ہی وجود میں آتی ہے' اور اس کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کی جانوں کا احترام کریں۔ اگر احترامِ جان ہی ختم ہو گیا تو گویا تمدن کی اساس ہی منہدم ہو گئی۔ لہٰذا تہذیب و تمدن کی بقا کے لیے لازم ہے کہ معاشرے کے اندر احترامِ جان کا پورا پورا اہتمام و التزام رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو بہت محترم ٹھہرایا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ بعض ایسی صورتیں ہیں کہ جہاں کوئی شخص قانون کی زد میں آ کر قتل کا مستوجب قرار پائے گا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

شریعت میں ﴿اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ کی مصداق چار صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ قتلِ عمد کی صورت میں اگر مقتول کے وارث دیت یا خون بہا لینے کے لیے بھی آمادہ نہ ہوں اور

معاف کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہوں تو جان کے بدلے جان لی جائے گی۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ ''جان کے بدلے جان ہے۔'' دوسری یہ کہ کوئی شخص شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے تو شریعت میں اس کے لیے رجم کی سزا ہے کہ اس کو سنگسار کیا جائے تا آنکہ وہ ہلاک ہو جائے۔ تیسری یہ کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے۔ چوتھی یہ کہ وہ کافر جو حربی ہو' جس کے ساتھ باقاعدہ اور اعلانیہ جنگ ہو رہی ہو۔ کسی اسلامی ریاست کا پُرامن ذمی یا معاہد غیر مسلم اس کا مصداق نہیں بن سکتا۔ اس کی جان تو اتنی ہی محترم ہے جتنی کسی مسلمان کی جان ہے۔ اُسے وہی تحفظات حاصل ہیں جو کسی مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ جہاں کفار و مشرکین کے ساتھ جنگ ہو رہی ہو وہاں کافر کی جان مؤمن کے لیے حلال ہوگی— ان چار صورتوں کے سوا کسی بھی حالت میں انسانی جان کا لینا قتل ناحق ہوگا— اور اس آیت مبارکہ کی رُو سے قتلِ ناحق کے متعلق یہ جان لیجیے کہ دینِ اسلام کے نظام میں شرک کے بعد یہ سب سے بڑا جرم ہے۔

جنسی بے راہ روی: تیسری بات فرمائی کہ: ﴿وَلَا يَزْنُوْنَ﴾ ''اور وہ زنا نہیں کرتے''۔ ہم اس سے پہلے سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی بعض آیات کے درس میں دیکھ چکے ہیں کہ اپنے شہوانی جذبات پر قابو پانے (Sex Discipline) کی کتنی اہمیت بیان ہوئی تھی۔ دونوں مقامات پر فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝﴾ یہاں وہی بات ہے لیکن اسلوب منفی ہے۔ وہاں مثبت پہلو سے بیان کیا گیا کہ وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں' اپنی شہوت پر قابو یافتہ ہیں' حلال راستہ کے علاوہ اپنی شہوت کی تسکین کے لیے کوئی حرام راستہ اختیار نہیں کرتے۔ یہاں وہی بات منفی اسلوب سے بیان فرمائی کہ ''وہ زنا نہیں کرتے''۔ البتہ یہاں جس سیاق (Context) میں یہ بات آئی ہے اس سے ہمارے سامنے یہ عظیم حقیقت آتی ہے کہ قتلِ ناحق کے بعد سب سے بڑا جرم زنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں یہ فعلِ بدرواج پا جائے

اس میں سے اعتمادِ باہمی اور محبت والفت بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ باہمی محبت کا سرچشمہ ایک شوہر اور اُس کی بیوی کے مابین اعتماد کا احساس ہے۔ اگر یہ اعتماد موجود ہے تو محبت بھی ہوگی' مَوَدت بھی ہوگی اور یہ خاندان اس دنیا میں جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ کی کیفیت کا مظہر بن جائے گا۔ لیکن اگر کسی معاشرہ میں بدچلنی کا رواج ہو جائے' شوہر کو بیوی پر اعتماد نہ رہے اور بیوی کا شوہر پر سے اعتماد اٹھ جائے اور بے اعتمادی باہمی اعتماد کی جگہ لے لے تو اُس معاشرے میں اعلیٰ اوصاف کبھی ترقی نہیں کریں گے۔ جو نئی نسل اس گھر میں پرورش پائے گی اس میں حسنات اور اعلیٰ اخلاق کبھی بھی نشو ونما نہیں پا سکیں گے' بلکہ ایسے ماحول میں پرورش پانے والی نسل میں ایک منفی کردار پیدا ہو جائے گا۔ تو گویا زنا وہ چیز ہے جو تمدن میں حسن وخوبی کے پھول کھلانے کے بجائے اسے ایک متعفن سنڈاس بنا کر رکھ دے گی۔ لہٰذا تیسری چیز ہے: ﴿وَلَا يَزْنُوْنَ﴾ ''اور وہ زنا نہیں کرتے''۔

گناہ کا خمیازہ اور رستگاری کی واحد صورت: توبہ

ان تین سب سے بڑے گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۝﴾ ''اور جو کوئی بھی یہ کرے گا وہ اس کی پاداش بھگت کر رہے گا''۔ یعنی جو کوئی بھی ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کرے گا ـــــ یعنی شرک کرے گا' اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے پکارے گا' کسی اور کی بھی عبادت کرے گا' یا وہ انسانی جان ناحق لے گا' انسانی خون ناحق بہائے گا' یا وہ زنا کرے گا ـــــ تو وہ جان لے کہ اس کی پاداش اس کو بھگتنی پڑے گی۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ بچ نکلے گا' کوئی گرفت نہیں ہے' کوئی سزا نہیں ہے۔ اگر اس دنیا میں اسے سزا نہیں ملی تو آخرت میں اسے اس کا بھرپور خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ ''قیامت کے دن اس کے لیے عذاب دوگنا کر دیا جائے گا''۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ لیا گیا ہے کہ یہ عذاب

بڑھتا چلا جائے گا' اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ بجائے اس کے کہ سزا اور عذاب میں تخفیف یا کمی واقع ہو' اس کی تندی اور سختی میں زیادتی ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے' جو اپنے اندر ایک لطیف نکتہ لیے ہوئے ہے۔ بعض حضرات کا یہ گمان ہے کہ عذابِ اُخروی اور یوم القیامۃ سے قبل عالم برزخ کے عذاب یا بالفاظِ دیگر عذابِ قبر کی جو خبریں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہیں' قرآن مجید میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ تو ایسے سب حضرات کے لیے جو قرآن میں ذکر نہ ہونے کی وجہ سے عذابِ قبر کو تسلیم کرنے میں متأمل ہیں' یہ مقام بہت ہی لائقِ توجہ ہے۔ فرمایا: ﴿يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ ''دوگنا کر دیا جائے گا اس کے لیے عذاب قیامت کے دن''۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل رہی ہے کہ قیامت کے دن سے پہلے بھی عذاب موجود ہے' جس کو دوگنا کرنے یا جس میں اضافہ کرنے کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ عذاب ہے جسے ہم عذابِ قبر سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کی خبر ہمیں نبی اکرم ﷺ نے احادیث میں دی ہے' اور یہ احادیث محدثین کے مقرر کردہ سخت سے سخت معیار کے مطابق مستند اور صحیح تسلیم کی گئی ہیں۔

اگر کسی کو یہ اشکال ہو کہ ابھی قیامت کی عدالت تو لگی ہی نہیں' ابھی حساب وکتاب اور وزنِ اعمال تو ہوا ہی نہیں تو اس سے پہلے سزا کیسی؟ تو ان کے اطمینان کے لیے عرض ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اسے خوب جانتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ۝﴾ یہ آیت ہم سورۃ القیامۃ میں پڑھ چکے ہیں۔ وہ طالب علم جس نے امتحان میں کچھ نہیں کیا' وہ جانتا ہے کہ اس نے پرچے کیسے کیے ہیں۔ چنانچہ امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی اس کی جان سوکھتی رہتی ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میری کارکردگی کیا ہے جس کا نتیجہ کے طور پر اعلان ہونے والا ہے۔ نتیجے کے اعلان کے دن سے پہلے ہی وہ گویا ایک نوع کے کرب اور کوفت کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو یہی ہے اصل حقیقت کہ اس دنیا سے عالمِ برزخ کی طرف منتقل ہونے کے فوراً بعد اس چیز کا ایک عکس انسان کی روح پر پڑنا شروع ہو جاتا ہے جو کچھ اس نے اس دنیا میں کیا

ہے۔ یہی ہے وہ بات جس کو نبی اکرم ﷺ نے یوں تعبیر فرمایا کہ ’’قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے‘‘۔ اِدھر آنکھ بند ہوئی‘ اُدھر عالم برزخ میں آنکھ کھل گئی‘ اور اس میں انسان پر ان کیفیات کا ایک عکس پڑنا شروع ہو جاتا ہے جن سے اُسے بالآخر اپنے اعمال کی پاداش میں قیامت کے دن دوچار ہونا ہے۔ اس آیت مبارکہ کے ایک حصہ میں کس قدر خوبصورتی سے اس طرف ایک لطیف اشارہ آ گیا: ﴿يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ قیامت کے دن تو عذاب دوگنا ہو جائے گا‘ عذاب بڑھ چڑھ کر آئے گا اور پھر انسان اس میں ہمیشہ ہمیش رہے گا۔ ﴿وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝۶۹﴾ خلود اور دوام اس کا مقدر ہوگا اور وہ اس میں رہے گا نہایت ذلیل و خوار ہو کر‘ رسوا ہو کر۔ اور یہ ذلت بھی دائمی ہوگی‘ اس سے رستگاری ممکن نہیں ہوگی۔ البتہ ایک استثناء ہے جو اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۷۰ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝۷۱﴾ (الفرقان)

’’سوائے اس کے جو تائب ہوا اور ایمان لایا اور اس نے اچھے عمل کیے‘ تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں اور نیکیوں سے بدل دے گا‘ اور اللہ تو ہے ہی مغفرت فرمانے والا‘ رحم فرمانے والا۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور اچھے عمل کرتا ہے تو وہی ہے جو توبہ کرتا ہے اللہ کی جناب میں جیسا کہ توبہ کرنے کا حق ہے‘‘۔

توبہ کی حقیقت و اہمیت

ان دو آیات کا مضمون ان سے پہلی دو آیات سے مربوط ہے‘ جن میں تین بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا گیا‘ یعنی شرک‘ قتل ناحق اور زنا— اور فرمایا گیا کہ جو کوئی ان جرائم کا مرتکب ہوگا اسے سزا مل کر رہے گی‘ اور سزا بھی وہ جس میں اضافہ ہوتا رہے گا‘ اور پھر اس کے لیے خلود یعنی ہمیشہ ہمیش کے لیے سزا ہے۔ تو یہ نقشہ بعض اعتبارات سے خاصا مایوسی پیدا کرنے والا ہے کہ اگر کسی شخص سے ان میں سے کسی جرم کا ارتکاب ہوا

ہو تو گویا یہ صورت حال اس کے لیے بڑی مایوس کن ہوگی۔ مایوسی کے اس اندھیرے میں اگلی دو آیات اُمید کی ایک کرن بن کر نمودار ہوتی ہیں۔

فرمایا: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ﴾ ہاں‘ جو توبہ کر لے وہ بچ جائے گا۔ معلوم ہوا کہ گناہ کے اثرات اشیاء کے مادی اور طبیعی اثرات کی طرح نہیں ہیں کہ ان کا ظہور لازماً ہو۔ جیسے اگر آپ نے آگ میں انگلی ڈالی تو وہ لازماً جل کر رہے گی۔ اس کے بعد اگر آپ توبہ کریں تو اس توبہ سے آگ کا انگلی پر جو اثر ہوا ہے وہ زائل نہیں ہوگا‘ وہ جلی رہے گی۔ اس لیے کہ یہ ایک طبیعی اثر (Physical Effect) ہے۔ لیکن اخلاقی جرائم کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اگر کوئی گناہ ہوا ہو‘ کوئی خطا ہوئی ہو تو لازم نہیں ہے کہ اس کا اثر ضرور ظاہر ہو۔ بلکہ اس سے بچاؤ کا ایک راستہ ہے‘ اور وہ درحقیقت توبہ کا راستہ ہے۔ توبہ کی عظمت اور توبہ کی حقیقت کے بیان میں قرآن کا یہ مقام نہایت اہم ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے اس کو قرآن مجید کی چوٹی قرار دینا غلط نہ ہوگا۔

پہلے اصولی طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ توبہ کی اہمیت کیا ہے! انفرادی اعتبار سے بھی یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی کہ اگر انسان اس مغالطہ میں مبتلا ہو کہ مجھ سے جو خطا ہو چکی ہے اس کی سزا تو مجھے لازماً بھگتنی پڑے گی‘ تو انسان پر مایوسی مسلط ہو جائے گی اور اصلاح کے لیے جو ہمت اور ارادہ درکار ہے‘ وہ اس میں باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ کتب احادیث میں ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ ملتا ہے جو جناب نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کو سنایا۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ متفق علیہ روایت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں ان میں سے کسی اُمت کے ایک فرد کا یہ واقعہ ہے کہ وہ بڑا سفاک قاتل تھا‘ اس نے ننانوے انسانوں کو قتل کیا تھا‘ لیکن پھر اس کی طبیعت میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی تو وہ ایک بہت بڑے عالم کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں ننانوے انسانوں کو قتل کر چکا ہوں‘ کیا اب بھی میری مغفرت کا کوئی راستہ کھلا ہے؟ اس عالم نے کہا کہ نہیں‘ تمہاری مغفرت کی اب کوئی سبیل نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص نے اُس عالم کو بھی قتل کر دیا کہ میں

ننانوے قتل تو پہلے ہی کر چکا ہوں' سو کیوں نہ پورے کر لوں!۔ پھر اس نے ایک اور بڑے عالم کی طرف رجوع کیا۔ اس نے بتایا کہ نہیں' اللہ کی مغفرت و رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا' اگر تم اب بھی صدقِ دل سے توبہ کرو تو اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا۔ پھر اس عالم نے اس کی رہنمائی بھی کی کہ فلاں جگہ چلے جاؤ' وہاں تمہیں بہتر ماحول ملے گا۔ تم اب تک جس ماحول میں رہے ہو اگر تم اسی میں رہے تو شاید تم اپنی اصلاح نہ کر سکو۔ وہ شخص اپنی اصلاح کے ارادے سے اس مقام کی طرف چل پڑا جس کی رہنمائی اس عالم نے کی تھی۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اس کی موت کا وقت آ گیا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں فرشتوں کے مابین یہ اختلاف رونما ہوا کہ اس کی روح کو عذاب والے فرشتے قبض کر کے لے جائیں یا رحمت والے فرشتے! اللہ کی طرف سے فرشتوں کو حکم ہوا کہ راستہ ماپ لو۔ وہ راستہ جس طرف وہ اصلاحِ احوال کی غرض سے قیام کے ارادے سے چلا تھا اگر اس راستہ سے کم رہ گیا ہے جو وہ طے کر چکا ہے تو اس کی روح کو رحمت کے فرشتے لے کر جائیں' بصورتِ دیگر اس کی روح کو عذاب والے فرشتے لے کر جائیں۔ راستہ ماپا گیا تو جس مقام کے ارادے سے وہ شخص چلا تھا وہ راستہ کم پایا گیا' لہٰذا رحمت والے فرشتے اس کی روح کو لے کر برزخ کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا تو وہ راستہ جو ابھی طے کرنا باقی تھا' وہ سمٹ گیا' جبکہ وہ راستہ جو وہ طے کر چکا تھا' وہ پھیل گیا۔

تو یہ ہے توبہ کا معاملہ انفرادی اصلاح کے ضمن میں کہ انسان جب بھی جاگ جائے' جب بھی ہوش میں آ جائے' اگر سچے دل سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ نے مغفرت کی امید دلائی ہے۔ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں کہ خواہ اس کے گناہوں کا ڈھیر کوہِ اُحد جتنا بلند ہو تب بھی سچی توبہ کے عوض اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا۔ اور مغفرت کے ضمن میں قرآن مجید کی سب سے زیادہ امید افزاء آیت سورۃ الزمر کی یہ آیت ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۵۳﴾

''(اے نبیؐ!) فرما دیجیے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے! اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ! اللہ تمام گناہ بخشنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اور وہ ہے ہی بخشنے والا' رحم فرمانے والا''۔

دنیا کے دوسرے مذاہب نے اپنے فلسفۂ اخلاق میں توبہ کے بارے میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں جس کے باعث ان کا نقطۂ نظر بہت کج ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک عقیدہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جو خطا ہو گئی تھی' جب کہ انہیں آزمائشی طور پر جنت میں رکھا گیا تھا اور ایک خاص درخت کا پھل کھانے سے منع کر دیا گیا تھا مگر شیطان کے ورغلانے سے انہوں نے اس درخت کے پھل کو کھا لیا تھا' تو یہ گناہ گویا اب نسل آدم میں منتقل ہو رہا ہے۔ نوع انسانی کا جو بچہ پیدا ہو رہا ہے وہ پیدائشی طور پر گناہ گار ہوتا ہے' وہ اپنے جدامجد کے گناہ کی گٹھری لے کر اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں یہ غلط عقیدہ ہو گا وہاں اس پر مزید غلطیاں ہوں گی۔ چنانچہ پھر ''کفارہ'' کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ یہ بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے غلطی ضرور ہوئی تھی' لیکن انہوں نے توبہ کی:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۲۳﴾ (الاعراف)

''اے ربّ ہمارے! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے' اب اگر تو ہم کو معاف نہیں فرمائے گا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو لازماً ہم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے''۔

اور سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ (البقرۃ:)

''آدم نے کچھ کلمات اپنے ربّ سے حاصل کیے (اور جب ان کلمات کے ذریعے اللہ سے توبہ کی) تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی''۔

مزید یہ کہ توبہ کے بارے میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی کتب احادیث میں موجود ہے:

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ)) (۱)

''جوکوئی کسی گناہ سے توبہ کر چکا اس کے لیے کوئی گناہ ہے ہی نہیں''۔

گویا وہ ایسے ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ لہٰذا اب اس کا کوئی سوال نہیں ہے کہ نسل آدم علیہ السلام کا ہر بچہ پیدائشی طور پر گناہ گار ہو— معاذ اللہ۔ قرآن مجید کا فیصلہ تو یہ ہے:

﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ﴾ (الروم: ۳۰)

''اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے''۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ))(۲)

یعنی نسلِ آدم کا ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے' وہ تو اس کے والدین ہیں جو اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ پس قرآن مجید کے فلسفہ میں اور بعض دوسرے مذاہب کے فلسفہ میں یہ بڑا عظیم فرق و تفاوت ہے۔

توبہ کی شرائط

اب ہمیں اس بات کو سمجھنا ہے کہ توبہ کی شرائط کیا ہیں! صرف زبان سے کہہ دینے سے توبہ نہیں ہو جائے گی۔ توبہ کی چند شرائط اور کچھ لوازم ہیں۔ اگر وہ شرائط پوری نہ ہوں تو چاہے آدمی توبہ کی تسبیح پڑھتا رہے اور صرف زبانی طور پر استغفار کا کتنا ہی ورد کرتا رہے اسے توبہ نہیں کہا جائے گا۔ چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو بہت بڑے محدث گزرے ہیں ''ریاض الصالحین'' میں توبہ کے باب میں علمائے اُمت کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ اگر توبہ کسی ایسے گناہ کے ضمن میں ہو جو حقوق اللہ سے متعلق ہے تو اس کے صحیح ہونے کی تین شرائط ہیں۔ لیکن اگر کوئی گناہ حقوق العباد کے ضمن کا ہے تو

(۱) سنن ابن ماجه ' كتاب الزهد' باب ذكر التوبة۔

(۲) صحيح البخاری' كتاب الجنائز' باب اذا اسلم الصبی فمات هل يصلى عليه وهل يعرض عليه۔ وصحيح مسلم ' كتاب القدر' باب صفی كل مولود يولد على الفطرة وحكم موت اطفال۔

ایک اضافی شرط مزید شامل ہو جائے گی۔ پہلی تین شرائط حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں مشترک ہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کے دل میں سچی اور حقیقی ندامت ہو کہ میں اب تک جو کچھ کرتا رہا ہوں غلط کرتا رہا ہوں۔ اس پر واقعی پشیمانی ہو۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے نوعمری کے دور کے اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے' جسے داغ دہلوی نے بہت پسند کیا تھا اور اس پر داد دی تھی کہ ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو اللہ کو بندے کی یہ پشیمانی اور ندامت بہت محبوب ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ عزمِ مصمم ہو کہ اب یہ کام دوبارہ نہیں کروں گا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ فی الواقع اس گناہ کو ترک کر دے اور عمل صالح کی روش اختیار کرے۔ یہ تین شرائط حقوق اللہ کے ضمن کے گناہوں سے متعلق ہیں۔ اضافی چوتھی شرط حقوق العباد کے معاملے میں ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی انسان کا حق مارا ہے تو اس کی تلافی کرے' کسی کا مال ہڑپ کیا ہے تو وہ مال واپس کرے یا اس سے معافی طلب کرے' کسی کی غیبت کی ہے تو اس کے پاس جا کر معافی چاہے' کسی پر ظلم کیا ہے تو اس کے لیے مظلوم سے عفو اور درگزر حاصل کرے۔ اس لیے کہ یہ جو حقوق العباد ہیں انہیں اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا۔ اگر اس دنیا میں ان بندوں سے جن کی حق تلفی کی گئی ہے' معافی حاصل نہیں کی جائے گی تو آخرت میں نیکیوں اور گناہوں کا لین دین ہوگا۔ یعنی ظلم اور زیادتی کرنے والے شخص کی نیکیاں اس شخص کو دے دی جائیں گی جس کے حق پر اس دنیا میں دست درازی کی گئی تھی یا جس پر ظلم کیا گیا تھا۔ اگر زیادتی کرنے والے کی نیکیوں کا سرمایہ ختم ہو جائے گا تو پھر مظلوم کے گناہ ظالم کے وزنِ اعمال کے پلڑے میں ڈال دیے جائیں گے۔

چنانچہ اس آیت پر غور کیجیے' فرمایا: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾۔ یہاں صرف ایک لفظ ''تَابَ'' نہیں آیا' بلکہ اس کے ساتھ ایمان اور عمل

صالح کا ذکر بھی ہے۔ توبہ کے معنی ہیں لوٹنا' پلٹنا' رجوع کرنا۔ تو فرمایا: ﴿مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ﴾ ''جو توبہ کرے اور ایمان لائے''۔ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر وہ پہلے کافر تھا' اب ایمان لا رہا ہے تو وہ بھی کفر سے پلٹنے اور ایمان لانے کے اعتبار سے ان الفاظِ مبارکہ کے ذیل میں آ جائے گا۔ دوسرا یہ کہ اگر وہ مسلمان تھا اور مسلمان ہوتے ہوئے بھی گناہ کر رہا تھا تو درحقیقت اس گناہ کی وجہ سے جو قلبی یقین والا ایمان ہے وہ زائل ہو گیا تھا۔ اب جب وہ توبہ کر رہا ہے تو گویا تجدید ایمان کر رہا ہے اور اس کے دل میں از سرِ نو ایمان داخل ہو رہا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو ایمان اس کے دل سے نکل کر پرندے کے مانند اس کے سر پر منڈلاتا ہے۔ اب اگر وہ توبہ کرتا ہے تو ایمان اس کے دل میں لوٹ آتا ہے''۔ لہٰذا جب دل میں تصدیق قلبی والا اور یقین والا ایمان ہو تو اس کے اثرات لازماً عمل پر مترتب ہوں گے اور وہ درست ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ کے فوراً بعد ایمان اور عمل صالح کا ذکر کیا گیا۔

پھر اس توبہ' تجدید ایمان اور اعمالِ صالحہ کے مرتبہ اور مقام کا ذکر بایں الفاظِ مبارکہ فرمایا: ﴿فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ﴾ ''پس ایسے لوگوں کے نامۂ اعمال میں سے اللہ ان کی برائیوں کو محو فرما کر ان کی جگہ نیکیوں کا اندراج فرما دے گا''۔ یہ ہے اللہ کی نگاہ میں توبہ کی عظمت۔ اس آیت کا اختتام ان الفاظ مبارکہ پر ہوتا ہے: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾ ''اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا' رحم فرمانے والا''۔ اس کی ذات والا صفات میں مغفرت و رحمت کی شانیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ لہٰذا ایک مؤمن کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ گناہ کی معافی کے لیے اس کی رحمت و مغفرت کے دروازے لوگوں کے لیے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں' بشرطیکہ وہ اس کی جناب میں پورے لوازم و شرائط کے ساتھ توبہ کریں۔

اگلی آیت میں اس بات کو پھر دہرایا گیا۔ عمل صالح توبہ کی شرطِ لازم ہے۔ انسان توبہ توبہ کہتا رہے اور اس کا عمل وہی رہے جو پہلے تھا تو یہ توبہ نہیں ہے' یہ تو اپنے آپ کو

دھوکہ دینا ہے۔ بلکہ فرمایا: ﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝﴾ ''جو شخص توبہ کرے اور عمل درست کرے تو وہ ہے کہ جو اللہ کی جناب میں توبہ کرتا ہے جیسا کہ توبہ کرنے کا حق ہے''۔

عبادُ الرحمٰن کے مزید اوصاف

عبادالرحمٰن کے اوصاف کے ضمن میں اگلی آیات میں فرمایا گیا:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝﴾ (الفرقان)

''اور وہ لوگ جو جھوٹ میں شرکت گوارا نہیں کرتے اور اگر اتفاقاً کسی لغو کام پر ان کا گزر ہو جائے تو وہ وہاں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں' اور وہ جنہیں جب اپنے ربّ کی آیات کے ذریعے سے تذکیر اور نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے ہو کر گر نہیں پڑتے۔ اور وہ جو کہتے ہیں: اے ہمارے ربّ! ہمیں عطا فرما ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک' اور ہمیں متقی لوگوں کا امام بنا۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جنہیں بدلے میں دیے جائیں گے بالا خانے بسبب ان کے صبر کے' اور اُن کا استقبال ہوگا جنت میں دعا اور سلام کے ساتھ۔ رہیں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیش۔ بہت ہی اچھی ہے وہ جگہ مستقل جائے قرار ہونے کے اعتبار سے بھی' اور تھوڑی دیر قیام کے لیے بھی''۔

سورۃ الفرقان کی مندرجہ بالا آیات میں پھر وہی مضمون آیا ہے جو اس سے پہلے اس رکوع کی تیسری آیت سے لے کر آٹھویں آیت تک آیا تھا۔ یعنی اللہ کے محبوب بندوں کے اوصاف۔ گویا وہ اوصاف جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں۔ اس رکوع کی

تیسری سے آٹھویں آیت تک چھ اوصاف کا ذکر ہو چکا ہے‘ جن میں سے پہلا وصف تواضع ہے‘ یعنی وہ لوگ جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں‘ ان کی چال سے عجز وانکسار اور تواضع کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسری صفت خواہ مخواہ کی بحث وتمحیص سے دامن بچانا ہے۔ اللہ کے ان محبوب بندوں سے جب مشتعل مزاج لوگ خواہ مخواہ حجت بازی پر اتر آتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر ان سے جدا ہو جاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ شب کی عبادت میں اللہ کے محبوب بندے اپنی راتیں اللہ کے حضور سجدے اور قیام میں گزارتے ہیں : ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝۶۴﴾۔ چوتھی صفت جہنم سے پناہ مانگتے رہنا بیان ہوئی‘ کہ اے ربّ ہمارے! ہمیں عذابِ جہنم سے بچا لے۔ ان کی پانچویں صفت میانہ روی ہے‘ بالخصوص خرچ کے معاملہ میں : ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝۶۷﴾۔ چھٹی صفت کبیرہ گناہوں سے بچتے رہنا ہے‘ جس کا ذکر سورۃ الشوریٰ اور سورۃ النجم میں بایں الفاظ مبارکہ آیا ہے : ﴿وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ﴾ ’’اور وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور فحش کاموں سے بالفعل مجتنب رہتے ہیں‘‘۔ اور ہم کئی مرتبہ دیکھ چکے ہیں کہ از روئے قرآن مجید کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے اور چوٹی کے گناہ تین ہیں : شرک‘ قتل ناحق اور زنا۔

ان چھ اوصاف کے ذکر کے بعد ایک ضمنی بحث توبہ کی حقیقت‘ توبہ کی اہمیت اور توبہ کی شرائط کے بارے میں آ گئی تھی۔ اب مضمون پھر اسی سلسلۂ گفتگو کی طرف لوٹ رہا ہے‘ یعنی عباد الرحمٰن کے اوصاف کیا کیا ہوتے ہیں۔

(۱) جھوٹ سے بیزاری

یہاں پہلا وصف بیان ہوا: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ﴾۔ ’’زُوْر‘‘ جھوٹ کو کہتے ہیں اور شَهِدَ يَشْهَدُ کا معنی موجود ہونا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ جھوٹ پر اپنی موجودگی بھی گوارا نہیں کرتے۔ کہیں جھوٹ کا معاملہ ہو رہا ہو‘ کہیں جھوٹ کی بنیاد پر لین دین ہو رہا ہو‘ کہیں کوئی سازش ہو رہی ہو‘ کہیں کچھ جھوٹ گھڑے

جا رہے ہوں تو ایسی جگہوں پر انہیں اپنی موجودگی تک گوارا نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جھوٹی گواہی اس میں ازخود آ جائے گی۔ جو لوگ جھوٹ میں ادنیٰ درجہ کی شرکت اور شمولیت گوارا نہیں کرتے وہ جھوٹی گواہی کیونکر دیں گے؟

(۲) لغویات سے کنارہ کشی

دوسرا وصف ہے: ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝۷۲﴾ یعنی وہ لوگ کہ جن کا کسی لغو اور بے کار کام کی طرف قصد اور ارادہ کر کے جانا تو سرے سے خارج از بحث ہے ہی‘ اگر کسی لغو کام پر ان کا اتفاقاً گزر ہو جائے‘ مثلاً راہ چلتے ہوئے جب دیکھیں کہ کوئی مداری تماشا دکھا رہا ہے تب بھی یہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے‘ بلکہ اپنے دامن کو بچاتے ہوئے وہاں سے گزر جاتے ہیں۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات میں آ چکا ہے : ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳﴾ لیکن یہاں جو فرق ہے اسے نوٹ کر لیجیے کہ ایک ہے لغو کام کا ارادہ کرنا۔ لیکن یہاں نقشہ یہ کھینچا گیا ہے کہ اس کا تو سوال ہی نہیں کہ اللہ کے یہ محبوب بندے کوئی لغو اور بے کار کام کریں۔ اگر اتفاقاً بھی کسی لغو کام پر ان کا گزر ہو جائے تو وہ باعزت طور پر اپنا دامن بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اصل میں مؤمن کو اپنے وقت کی قدر ہوتی ہے۔ یہ محدود سا وقت اور محدود سی فرصت جو اِس دنیا میں حاصل ہے‘ یہ بڑی قیمتی ہے۔ اس لیے کہ اس کے نتائج اس دنیا میں نکلیں گے جو لامحدود ہے۔ لہٰذا نتیجہ کے اعتبار سے اُس زندگی کا ہر لمحہ اَمر ہے۔ اس کا ثمرہ اس زندگی میں ملے گا جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے پاس کوئی فالتو وقت نہیں ہوتا کہ اسے بے کار کاموں میں صرف کریں۔

(۳) آیاتِ الٰہی پر تفکر وتدبر

تیسرا وصف یہ بیان ہوا کہ جب انہیں ان کے ربّ کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اندھے بہرے ہو کر نہیں گر پڑتے : ﴿لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝۷۳﴾ اس میں کفار کی طرف ایک تعریض ہے کہ انہیں جب آیاتِ الٰہی

سنائی جاتی ہیں تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جیسے وہ ان کی مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ وہ غور ہی نہیں کرتے' سنتے ہی نہیں' تدبر ہی نہیں کرتے۔ پہلے ہی سے طے کیے بیٹھے ہوتے ہیں کہ اعتراضات وارد کریں۔ یہ معاملہ مذکورہ بالا اوصاف کے حامل عباد الرحمٰن کا نہیں ہوتا ہے۔ اس قدر (value) کو اگر ہم مثبت طور پر معین کریں تو وہ یہ ہوگی کہ آیاتِ قرآنیہ پر' آیاتِ ربانیہ پر تدبر و تفکر ہو' ان پر غور کیا جائے' انہیں گوشِ حقیقت نیوش سے سنا جائے' انسان ان آیاتِ الٰہیہ کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرے۔

(۴) اہل وعیال کے لئے دُعا

چوتھا وصف انسانی فطرت سے وابستہ ہے۔ جو شخص خود نیک ہوگا اور سیدھے راستے پر زندگی بسر کر رہا ہوگا' لازماً اس کی تمنا ہوگی کہ اس کے اہل وعیال بھی اسی راستہ پر چلیں اور وہ بھی تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ لہٰذا وہ اپنے ربّ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ: ﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ﴾ ''اے ہمارے ربّ! ہمیں اپنی بیویوں سے اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما''۔ ایک مؤمن کی آنکھوں کی ٹھنڈک اسی میں ہے کہ اس کی اولاد بھی ایمان و اسلام اور تقویٰ و احسان کے راستہ پر گامزن ہو' اس کے گھر میں برّ و تقویٰ کا ماحول ہو۔ چنانچہ اس معاملے میں ہمارے قریب کے زمانہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مثال بڑی عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بیٹے عطا فرمائے' شاہ عبدالقادر' شاہ عبدالعزیز' شاہ عبدالغنی اور شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہم۔ یہ چاروں نہایت نیک اور نہایت پارسا تھے۔ ان میں سے دو بیٹے تو وہ ہیں (یعنی شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین) جنہوں نے قرآن مجید کے اردو میں اولین ترجمے کیے اور آج تک مستند ترین ترجمے وہی ہیں۔ تیسرے بیٹے نے دہلی میں درس گاہ قائم کی جو مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے نام سے مشہور ہے جس سے برعظیم پاک و ہند میں بہت علم پھیلا۔ جبکہ چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی کا نوجوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا' لہٰذا کسی علمی میدان میں ان کی صلاحیتیں زیادہ نمایاں نہیں ہوسکیں۔ تاہم اس کی تلافی اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرما دی کہ آگے ان کے بیٹے

شاہ اسماعیل شہیدؒ تھے اور ان کا نام اپنے اس نامور عالم و مجاہد اور شہید بیٹے کی وجہ سے روشن ہوا۔ تو آپ غور کیجیے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی اولاد کو ان کیفیات میں دیکھ کر کس قدر آنکھوں کی ٹھنڈک میسر آتی ہوگی!

(۵) ''متقیوں کی پیشوائی'' کی دُعا

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ اور وہ یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ ''ہمیں متقیوں کا امام بنا دے''۔ ان الفاظ سے یہ مضمون بھی متبادر ہوسکتا ہے کہ یہ دعا کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک لوگوں کا امام اور پیشوا بنائے' نیک لوگوں کے آگے چلنے والا بنائے۔ اگرچہ اس کی خواہش رکھنا بھی کوئی بری بات نہیں ہے' لیکن جس سیاق و سباق میں یہ الفاظ آ رہے ہیں اس کے اعتبار سے ان کا مفہوم کچھ دوسرا ہے۔ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعے پہلی بات ہی کی مزید تاکید ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ ہر شخص فطری طور پر اپنے اہل وعیال کا امام ہے۔ قیامت کے روز جب لوگ اٹھیں گے تو ان کے پیچھے ان کی نسلیں چلی آ رہی ہوں گی' ان کی اولاد و اخلاف ان کے پیچھے چلے آ رہے ہوں گے۔ تو گویا وہی بات ذرا اسلوب بدل کر کہی گئی ہے کہ اے رب ہم جن کے امام ہیں ان کو متقی بنا دے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے پیچھے آنے والے' ہماری آئندہ نسلیں فساق و فجار پر مشتمل ہوں۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مُسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ))[1] یعنی ''تم میں سے ہر ایک کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے ریوڑ کے بارے میں جواب دہ ہے''۔ جیسے بھیڑ بکریاں چرانے والا ایک چرواہا ہوتا ہے اور چند بھیڑ بکریاں اس کی ذمہ داری میں ہوتی ہیں' شام کو اگر کوئی بھیڑ یا بکری لوٹ کر نہ آئی تو اس سے پوچھا جائے گا' وہ ان کے بارے میں مسئول ہے۔ اسی طرح تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے' اللہ نے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد تمہارے حوالے کر دیے ہیں' وہ تمہاری بیویاں ہیں' تمہاری اولاد ہیں' وہ تمہارے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب الجمعة فی القری والمدن۔

زیرِ کفالت ہیں‘ وہ تمہارے زیرِ تربیت ہیں‘ یہ تمہارا وہ گلہ ہے جس کے بارے میں اللہ تم سے پوچھے گا کہ تم نے ان کی صحیح رُخ پر تعلیم و تربیت کا کتنا اہتمام کیا؟ انہیں اللہ کے نیک اور متقی بندے بنانے کے لیے کتنی محنت کی؟ یہ ہے مفہوم اس ارشادِ نبویؐ کا ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مُسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ))۔ چنانچہ ہر بندۂ مومن کی یہ دعا ہونی چاہیے کہ اے اللہ! جو گلہ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے‘ جس کی ذمہ داری تو نے مجھے سونپی ہے‘ اس کو توفیق دے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کی روش اختیار کرے‘ اور ہم کو ایسے متقیوں کا امام بنا۔ ﴿وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾﴾

صبر و استقامت کا بدلہ: جنت

آگے فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ ’’یہ وہ لوگ ہیں جنہیں جزا کے طور پر جنت میں بالا خانے ملیں گے بسبب ان کے صبر کے‘‘۔ اس آیت میں گویا عباد الرحمٰن کا چھٹا اور نہایت اہم وصف آ گیا۔ ’’بِمَا صَبَرُوْا‘‘ یعنی یہ درحقیقت بدلہ ہے اس صبر کا جو انہوں نے اللہ کی راہ میں کیا۔ یہ وہ بات ہے جو ہم سورۃ العصر کے ذیل میں بھی پڑھ چکے ہیں اور سورۃ لقمان کے دوسرے رکوع میں بھی کہ ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ﴾ ظاہر بات ہے کہ یہ تمام اوصاف انہی لوگوں میں پیدا ہو سکتے ہیں جن میں صبر کا مادہ ہو‘ تبھی وہ دُنیوی لذات و ترغیبات سے کنارہ کشی کر سکیں گے‘ ہوائے نفس سے اجتناب کر سکیں گے اور شیطان کے اغوا سے بچ سکیں گے۔ یہ سب کام اسی وقت ممکن ہوں گے جب ان میں صبر کا مادہ ہوگا۔ پھر دنیا میں نیکی‘ راست بازی اور صداقت شعاری کا راستہ اختیار کرنے والوں کو آزمائشوں سے سابقہ پیش آ کر رہے گا۔ ان آزمائشوں پر صبر کر کے ہی وہ بر و تقویٰ کی راہ پر مستقیم رہ سکیں گے۔ جیسے سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی آیات میں ہم نے پڑھا تھا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ تو یہ استقامت اور یہ صبر ہی درحقیقت وہ جوہر ہے کہ جس کی بنیاد پر انسان دنیا میں وہ روش اختیار کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس میں وہ اوصاف پیدا ہو سکتے ہیں جن کا یہاں ذکر

ہوا—— اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ: ﴿وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا﴾ ’’ان لوگوں کا جنت میں استقبال ہوگا دعاؤں کے ساتھ اور سلام کے ساتھ‘‘۔ ظاہر بات ہے کہ یہ استقبال کرنے والے جنت کے فرشتے ہوں گے۔

آگے فرمایا: ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ’’اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے‘‘۔ جنت وہ جگہ ہے کہ ایک بار داخلے کے بعد وہاں سے نکلنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ﴿حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾﴾ ’’وہ جنت بہت ہی عمدہ جگہ ہے مستقل رہنے کے لیے بھی اور تھوڑی سی دیر کے قیام کے لیے بھی‘‘۔ اس رکوع میں پہلے جہنم کا ذکر آیا تھا‘ اب یہاں جنت کا ذکر تقابل (contrast) کے طور پر آیا ہے۔ کیونکہ دنیا میں ہمارا تصور یہ ہے کہ کتنی ہی عمدہ جگہ پر بھی اگر مستقل رہنا پڑے تو اس میں انسان کے لیے کوئی دلچسپی اور رعنائی نہیں رہتی اور اگر بری سے بری جگہ پر بھی تھوڑی سی مدت کے لیے جانا ہو‘ جیسے صحرائے اعظم میں انسان تھوڑے عرصہ کے لیے چلا جائے تو تبدیلی (change) کی وجہ سے ایک تفریح ہو جاتی ہے‘ ایک مہم جوئی کا احساس ہوتا ہے۔ تو جہنم کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایسی بری جگہ ہے کہ مستقل جائے قرار کی حیثیت سے تو انتہائی خوفناک ہے ہی‘ اگر کوئی ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں داخل ہو جائے تو اس دوزخ کی تمام شدتیں‘ غلظتیں اور ساری کلفتیں آنِ واحد میں عیاں ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جنت وہ جگہ ہے کہ وہاں تھوڑی دیر ہی نہیں بلکہ مستقل قیام ہوگا‘ لیکن اس کے حسن میں‘ اس کی رعنائیوں میں‘ اس کی دلچسپیوں میں کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی اور انسان اس سے کبھی بھی نہیں اکتائے گا۔

نبوت و رسالت کی غرض و غایت

آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ ﴾ (الفرقان)

’’(اے نبی ﷺ!) فرما دیجیے: میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے اگر نہ ہوتا

تمہارا پکارنا' سو تم جھٹلا چکے ہو' اب اس کی سزا جلد ہی تمہیں چمٹ کر رہے گی''۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت میں اور اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں بڑا گہرا ربط و تعلق ہے۔ پہلی آیت مبارکہ ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۙ﴾

''بڑی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے نازل فرمایا الفرقان اپنے بندے پر تا کہ وہ تمام جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والے بن جائیں''۔

ایمانیات کے ذیل میں یہ بات ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ ایمان کے تین بڑے بڑے اجزاء ہیں: (۱) ایمان باللہ یا توحید (۲) ایمان بالآخرۃ یا معاد' اور (۳) ایمان بالرسالت۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی پہلی دو آیات ایمان باللہ سے بحث کرتی ہیں۔ فرمایا گیا:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾﴾

میں نے عرض کیا تھا کہ ان سب کا نتیجہ ایمان باللہ ہے۔ سورۃ الفرقان کی پہلی اور آخری آیت کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ رسولوں کو کیوں بھیجتا رہا! نبوت و رسالت کی غرض و غایت کیا ہے! سورۃ النساء کی آیت ۱۶۵ میں یہ مضمون بڑی وضاحت سے اور بڑے واضح الفاظ میں آیا ہے۔ فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ﴿۱۶۵﴾﴾

''ہم اپنے رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجتے رہے ہیں تا کہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے یہاں کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اور اللہ تو ہے ہی غالب' حکمت والا''۔

معلوم ہوا کہ رسولوں کو بھیجنے کا ایک اہم مقصد ''اتمامِ حجت'' اور ''قطعِ عذر'' تھا' تا کہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ اے اللہ! ہمیں پتا نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ

تجھے کون کون سے اوصاف پسند ہیں! ہم جانتے نہیں تھے کہ تو کن چیزوں سے ناراض ہوتا ہے! اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں سماعت و بصارت' عقل و شعور اور نیکی و بدی کی تمیز جیسی بہت سی چیزوں سے مسلح کر کے بھیجا ہے اور یہ بنیادی اور ابتدائی حجت ہے جو ہر انسان پر قائم ہے' لیکن اتمامِ حجت تب ہوتا ہے جب رسول تشریف لاتے ہیں۔ چنانچہ رسولوں نے حق کو قولاً اور عملاً پیش کر دیا۔ سچ بولنے کی ترغیب دی تو ساری عمر سچ بول کر دکھایا۔ دیانت اور امانت کی تلقین کی تو اپنی زندگیوں میں دیانت و امانت کا نمونہ پیش فرما دیا۔ عدل و قسط کی تاکید کی تو دوست و دشمن کی تمیز و امتیاز کے بغیر عدل و انصاف کر کے دکھایا۔ عفو و صفح کی نصیحت کی تو اپنی جان کے دشمنوں اور خود اپنے اوپر اور اپنے ساتھیوں پر بے پناہ مظالم ڈھانے والوں کو معاف کر کے دکھایا۔ جو دعوت دی اس کا عملی نمونہ بھی لوگوں کے سامنے رکھ دیا۔ تو گویا لوگوں پر قولاً اور عملاً آخری درجہ میں حجت قائم ہوگئی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت میں بیان فرمائی گئی ہے۔

یہی مضمون سورۃ الفرقان کی پہلی آیت میں آیا ہے کہ انبیاء و رُسل کی اس مقدس جماعت میں حضور ﷺ کی ایک امتیازی شان ہے۔ پہلے بھی رسول بشیر و نذیر بن کر آتے تھے لیکن وہ اپنی اپنی قوموں کی طرف آتے تھے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون تکرار کے ساتھ آیا ہے: ﴿وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۔۔۔ وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۔۔۔ وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا﴾ ''اور قومِ عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ اور قومِ ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ اور ہم نے مدین (میں رہنے والی قوم) کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔۔۔'' چنانچہ مطالعہ قرآن حکیم کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل نبوت اور رسالت کا معاملہ علاقائی یا قومی ہوتا تھا' لیکن جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر جو نبوت کا اختتام و اتمام ہوا اور رسالت کی تکمیل ہوئی' اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ حضور ﷺ سارے جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والے بن کر تشریف لائے اور قرآن مجید' فرقانِ حمید اسی مقصد

کے لیے نازل فرمایا گیا:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝۱﴾

یہی بات سورۃ الانبیاء میں بایں الفاظ مبارکہ فرمائی گئی: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ اور سورۂ سبا میں حضور ﷺ کی آفاقی و عالمی شان کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرمایا گیا:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾

''اور (اے نبیؐ!) ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر!''

لیکن یہ بات جان لیجیے کہ رسول ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برہان، دلیل اور بیّنہ بن کر تشریف لاتے ہیں، لہٰذا جہاں رسولوں کی بعثت رحمت ہے وہاں جو انکار کرنے والے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں یہی چیز موجب عذاب اور موجب سزا بھی ہے۔ رسولوں کی آمد سے پہلے ان کے پاس کوئی عذر تو تھا کہ اے اللہ ہمیں معلوم نہیں تھا، ہم جانتے نہیں تھے کہ تیری رضا کیا ہے۔ لیکن رسولوں کے آنے کے بعد یہ عذر ختم ہو گیا۔ اب محاسبہ شدید ہوگا اور پکڑ سخت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بار بار اُن قوموں کا ذکر ہوا ہے جن کی طرف رسولوں کو مبعوث فرمایا گیا، اور جب انہوں نے ان رسولوں کا انکار کیا، ان کی تکذیب کی، ان کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو اور ان چند لوگوں کو جو اُن رسولوں پر ایمان لائے تھے، بچا لیا اور اُن قوموں کو ہلاک کر دیا۔ سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت میں اہل عرب کو یہی تنبیہہ فرمائی جا رہی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ہمارے رسول اگر تمہیں دعوت دے رہے ہیں، تبلیغ کر رہے ہیں، تمہارے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں، ایک ایک گھر پر جا کر پیغامِ ربانی پہنچا رہے ہیں، ایک ایک انسان کے دل پر دستک دے رہے ہیں تو میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا ہے۔ اللہ کو ہرگز تمہاری کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر تمہیں پکارنا اور خبردار کرنا مقصود نہ ہوتا تو ہمارے رسول یہ مشقت نہ جھیلتے۔ اس لیے کہ اللہ کی سنت یہی ہے کہ کسی قوم پر عذاب

بھیجنے سے پہلے اُسے متنبہ اور خبردار کر دیا جائے، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝﴾

''ہم عذاب نہیں بھیجتے رہے ہیں جب تک رسولوں کو مبعوث نہ فرما دیں''۔

یعنی رسولوں کی آمد کے ذریعے جب تک اتمامِ حجت نہ ہو جائے اس سے پہلے قومیں ہلاک نہیں کی جاتیں۔ لہٰذا یہاں نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ میں نے تم تک تمہارے ربّ کا پیغام پہنچا دیا، تمہارے سامنے تمہارے ربّ کی دعوت پیش کر دی۔ مجھ تک جو ہدایت ربّانی آئی تھی، اسے قولاً اور عملاً تمہارے سامنے پیش کر دیا۔ یہ تمہارے ہی نفع کے لیے کیا گیا ہے، ورنہ میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے۔ ﴿مَا یَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّیْ﴾۔ یہ تبلیغ و دعوت اس لیے ہے کہ تم کو خبردار کر دیا جائے۔ اگر تمہیں پکارنا نہ ہوتا: ﴿لَوْ لَا دُعَاؤُكُمْ﴾ تو رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری بھی مجھ پر نہ ہوتی۔ لیکن ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ﴾ ''پس تم جھٹلا چکے (تم تکذیب کر چکے)''۔ عربی زبان میں فعل ماضی پر جب ''قَدْ'' کا اضافہ ہو جاتا ہے تو اس میں کسی کام کے ہو جانے میں قطعیت و حتمیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں Present Perfect Tense کا جو مفہوم ہوتا ہے، یعنی کام ہو چکا ہے، بات ہو چکی ہے، یہی مفہوم عربی میں فعل ماضی پر ''قَدْ'' کا اضافہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ﴾ ''سو لوگو! تم جھٹلا چکے ہو۔ اب عنقریب اس کی پکڑ آ کر رہے گی۔ ﴿فَسَوْفَ یَكُوْنُ لِزَامًا ۝﴾۔ لازم و ملزوم کے الفاظ ہم عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ ''لِزَامًا'' کے معنی ہوں گے جسے کوئی چیز چمٹ کر رہ جائے، چپک کر رہ جائے۔ تو فرمایا: ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ یَكُوْنُ لِزَامًا ۝۷۷﴾ ''سو تم نے (دعوتِ ربانی کو) جھٹلا دیا، پس عنقریب اس کا وبال تم پر لاگو ہو کر رہے گا''۔ تمہیں اس تکذیب کی سزا مل کر رہے گی۔

یہ آیتِ مبارکہ نہ صرف اُن لوگوں کے لیے بہت اہم ہے جو قرآن مجید کے اوّلین مخاطب تھے اور جن کے سامنے جناب محمد رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس خلق خدا کو

دعوت پہنچا رہے تھے‘ بلکہ ہمارے لیے بھی بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا جو اختتام و اتمام ہوا ہے‘ رسالت کی جو تکمیل ہوئی ہے‘ اس کا ایک مظہر وہ ہے جو میں پیش کر چکا ہوں کہ حضور ﷺ کی بعثت پوری نوع انسانی کے لیے ہے۔ اور اسی کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ آپ ﷺ ہی کا دورِ رسالت تا قیامِ قیامت جاری ہے۔ یہ دور جس میں ہم سانس لے رہے ہیں‘ یہ بھی دورِ رسالت محمدی ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ ہر انسان جو آج دنیا میں پیدا ہو رہا ہے اور قیامت تک پیدا ہوگا وہ نبیٔ آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی اُمتِ دعوت میں شامل ہے۔ ہاں اُمت اجابت میں وہی شامل ہوگا جو نبی اکرم ﷺ کی دعوت پر لبیک کہے‘ حضور ﷺ کی تصدیق کرے‘ حضور ﷺ پر ایمان لائے۔ لیکن اُمت دعوت سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جن کی طرف کسی رسول کو بھیجا گیا ہو۔ جیسے حضرت ہود علیہ السلام کی اُمتِ دعوت قومِ عاد تھی‘ حضرت صالح علیہ السلام کی اُمتِ دعوت قومِ ثمود تھی‘ اسی طرح جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمتِ دعوت پوری نوعِ انسانی ہے۔ اور پیغامِ ربانی کو جس طرح نبی اکرم ﷺ نے بنفس نفیس ان لوگوں کو پہنچایا جو آپ ﷺ کے مخاطبین اوّلین تھے‘ اسی طرح یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم روئے ارضی پر بسنے والے ہر شخص تک اسے پہنچائیں۔ حضور ﷺ نے تکلیفیں جھیل کر اور مصیبتیں اٹھا کر یہ فریضۂ دعوت انجام دیا۔ آپؐ کا تمسخر و استہزاء بھی ہوا‘ آپؐ پر پتھراؤ بھی ہوا‘ آپؐ کے راستہ میں کانٹے بھی بچھائے گئے‘ آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس طرح بل دیا گیا کہ چشم ہائے مبارک اُبل پڑنے کو ہوئیں۔ آپؐ پر کوڑا کرکٹ ڈالا گیا۔ آپؐ کے شانۂ مبارک پر‘ جبکہ آپؐ سربسجود تھے‘ اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی رکھی گئی۔ طائف کی گلیوں میں آپؐ پر پتھروں کی اس طور پر بارش ہوئی کہ جسد اطہر لہولہان ہوگیا اور جسم اقدس سے خونِ اقدس بہہ بہہ کر نعلین شریف میں جم گیا۔ یہ ساری تکلیفیں آپ ﷺ نے جھیلیں‘ لیکن دین کا پیغام پہنچا کر حجت قائم کر دی۔

اب یہ کام اُمتِ مسلمہ کے ذمہ ہے‘ میرے اور آپ کے ذمہ ہے‘ حضور ﷺ کے

ہر اُمتی کے ذمہ ہے کہ اللہ کا پیغام ایک ایک فردِ نوعِ بشر تک پہنچائیں۔ یہ ہر مسلمان کی دینی ذمہ داری ہے۔ اگر پہنچا دیں تو ہم بریٔ الذمہ ہو جائیں گے۔ جن تک بات پہنچا دی جائے اگر وہ دعوت کو ردّ کریں اور اس کو قبول کرنے سے انکار کریں تو پھر وہ ذمہ دار ہوں گے‘ سارا بوجھ اُن پر آئے گا۔ لیکن اگر معاملہ وہ ہو جو فی الواقع ہمارا ہے کہ ہم دوسروں تک کیا پہنچائیں آج خود ہم اس بات کے محتاج ہو گئے ہیں کہ قرآن ہمیں پہنچایا جائے‘ تو مجرم ہم ٹھہریں گے۔ سو معلوم ہوا کہ ہمارے شانوں پر دوہری ذمہ داری آ گئی۔ جن تک پیغام پہنچانا تھا اگر اُن تک پیغام نہیں پہنچ رہا‘ انذار نہیں ہو رہا‘ دعوتِ ربانی کا حق ادا نہیں ہو رہا‘ تو ان لوگوں کی غلط روی اور گمراہی کا وبال بھی ہم پر آئے گا۔ اور خود ہمارا اپنا حال یہ ہے کہ اگرچہ ہم قرآن کے ماننے والے ہیں اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے نام لیوا ہیں‘ لیکن اِلَّا ماشاء اللہ‘ ہم عملاً تو تکذیب کر رہے ہیں۔ ایک تکذیب قولی ہوتی ہے کہ کسی نبی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ نبوت کا غلط دعویٰ کر رہا ہے‘ جھوٹ گھڑ رہا ہے۔ جیسے ابوجہل اور ابولہب نے حضور ﷺ کی تکذیب کی۔ جبکہ ایک تکذیب عملی ہوتی ہے کہ بظاہر زبان سے حضور ﷺ کو نبی اور رسول مان لیا جائے‘ لیکن آپؐ کے احکام کو تسلیم نہ کیا جائے۔ تکذیب عملی کی ایک مثال قرآن مجید میں سورۃ الجمعہ میں آئی ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

’’مثال اُن کی جو حامل تورات بنائے گئے تھے‘ پھر انہوں نے اس کی ذمہ داری کو ادا نہ کیا‘ اس گدھے کی مانند ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو‘ اور بہت بری ہے مثال اس قوم کی جس نے آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب کی۔ اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا‘‘۔

اب آپ اس آیت مبارکہ کے ان الفاظ پر غور فرمائیے: ﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ﴾ ہم سب جانتے ہیں کہ یہود نے زبان سے کبھی تورات

کی تکذیب نہیں کی۔ تو غور طلب بات یہ ہے کہ یہ تکذیب کون سی ہے! یہ تکذیب درحقیقت تکذیبِ عملی ہے کہ تورات کے کتاب اللہ ہونے کا زبانی اقرار تو موجود ہے لیکن اُس پر عمل نہیں ہو رہا۔ اور ظاہر بات ہے کہ تورات پر ایمان کا دعویٰ کرنے والے اگر اُس کے احکام پر کاربند نہیں ہیں' اگر تورات کے نواہی سے اجتناب نہیں کیا جا رہا' جو ذمہ داریاں تورات نے عائد کی ہیں اگر انہیں ادا کرنے سے پہلوتہی کی جا رہی ہے' اُن سے اغماض برتا جا رہا ہے' تو چاہے زبان سے یہود اقرار کرتے ہوں کہ وہ تورات کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں لیکن حقیقتاً اور عملاً یہ رویہ تورات کی تکذیب کے مترادف ہے۔ آج اگر ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں تو نظر آئے گا کہ بعینہٖ یہی معاملہ ہمارا ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے ہمیں پہلے ہی سے متنبہ فرما دیا تھا۔ بڑی پیاری حدیث ہے جس کا آغاز ''یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ'' کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یعنی ''اے قرآن والو!'' جیسے قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ سے ''یَا اَھْلَ الْکِتٰبِ'' کے الفاظ سے خطاب ہوتا ہے' محبوبِ ربّ العالمین ﷺ ہم مسلمانوں سے خطاب فرما رہے ہیں ''یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ'' کے الفاظ سے۔ ارشاد ہوتا ہے: ((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ))(۱) ''اے قرآن والو! قرآن حکیم کو اپنا تکیہ نہ بنا لینا''۔ اُسے ایک ذہنی سہارا نہ بنا لینا۔ قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا۔ تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے' ایسا نہ ہو کہ تم قرآن کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دو۔ بلکہ تمہارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے:

((وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ)) ''اُسے پڑھو جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے' رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی''۔ ((وَافْشُوْهُ)) ''اور اُسے پھیلاؤ''۔ اُسے عام کرو' اس کی تبلیغ کرو' اس کے نور سے چہار دانگِ عالم کو منور کرو۔ ((وَتَغَنَّوْهُ)) ''اور اُسے خوش الحانی سے پڑھو'' کہ اس سے تمہاری روح کو غذا میسر آئے۔ ((وَتَدَبَّرُوا فِيْهِ)) ''اور اُس میں تدبر کرو' (غور و فکر کرو)''۔ وہی بات جو ہم نے اس رکوع میں پڑھی کہ ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ

(۱) رواه البيهقي في شعب الايمان

رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا﴾ چنانچہ قرآن پر تدبر ہو' غور و فکر ہو۔ آخر میں ارشاد فرمایا: ((لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ)) ''تاکہ تم فلاح پاؤ''۔

پس اگر ہم قرآن مجید کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرتے جس کا حکم نبیٔ اکرم ﷺ کی اس حدیث میں آیا ہے تو چاہے زبان سے ہم مانتے ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے' لیکن حقیقتاً ہم تکذیب کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں۔ اور یہی عملی تکذیب ہے۔ اس معنی میں اس آیت مبارکہ کے مخاطبین میں ہم بھی شامل ہیں: ﴿قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ﴾۔ اے نبیؐ! ان لوگوں کے کان کھول دیجئے' انہیں یہ بات سنا دیجئے کہ میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے' بلکہ اُس نے اگر مجھے مبعوث فرمایا ہے' مجھ پر یہ قرآن نازل فرمایا ہے تو صرف اس لیے کہ تم پر اتمامِ حجت کرنا مقصود ہے۔ لہٰذا میں نے تو تبلیغ کا حق ادا کر کے تم پر حجت قائم کر دی ہے۔ لیکن ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ﴾ تم جھٹلا چکے ہو' تم نے کفر کی روش اختیار کی ہے' خواہ یہ جھٹلانا قولاً ہو یا عملاً ہو' ﴿فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا﴾ پس جان رکھو کہ جلد ہی اس کی سزا تم سے چمٹ کر رہے گی۔ اس کی پاداش تم کو بھگتنی پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ اس انجامِ بد سے ہمیں بچائے!

بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ وَنَفَعَنِيْ وَاِيَّاكُمْ بِالْاٰيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ○○

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان .....اور..... **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے .....اور.....اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ - اور - **غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہوسکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام — نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**